***Journal of Religion & Society* (JR&S)**
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

The Concept of Divine Love (Ishq-e-Haqiqi) in Islamic Sufism: A Comparative Study with Modern Philosophy of Love

اسلامی تصوف میں عشقِ حقیقی کا تصور: جدید فلسفۂ محبت کے ساتھ تقابلی مطالعہ

Dr. Zeeshan
Lecturer, Department of Islamic Studies, KUST
dr.zeeshan2021@kust.edu.pk

Abstract
This paper examines the deep meaning of ʿIshq-e-Haqiqi (Divine Love) within the Islamic Sufism, and makes a comparison with the contemporary philosophical conceptualization of love. Divine Love in the Sufi philosophy is the ultimate state of spirituality with which the human soul becomes united with the Divine beyond all the obligations and desires of the world. It is not just a feeling of emotion or romance but a kind of change that results in self purification (tazkiyah al-nafs) and spiritual enlightenment. Classical Sufi teachers, including Rabi al-Basri, Jalal al-Din Rumi and Ibn ʿArab 2, also understood love as the axis of human life, the expression of God by the annihilation (fanāʾ) and subsistence (baq) of the soul in Him. Conversely, the current philosophy explains love in the psychological, moral, and existential terms. Philosophers such as Sren Kierkegaard, Jean-Paul Sartre, and Erich Fromm consider love a moral obligation, a fight of recognition or a performance of creative will which confirms human liberation and meaning. Unlike Sufism, which finds love in the relation of the Divine and human, contemporary philosophy can tend to interpret love as a way of fulfilling the potential of human beings and their authenticity in a secular environment. By comparing them, this study can show that even though these traditions have different metaphysical premises, both of them consider love as an agent of change and a power that is uniting one that overcomes egoism and makes people connected to a larger reality, divine or existential. However, the bottom line of this study is that Sufi ʿIshq-e-Haqiqi and modern understanding of love both require self-surpassing, moral elevation and ultimate truth and unity and as such, they therefore represent the time-tested vision of human fulfillment in the modern era.

Keywords: Islamic Sufism, Divine Love (*ʿIshq-e-Haqiqi*), Modern Philosophy of Love, Mysticism and Spirituality, Existentialism and Ethics, Comparative Philosophy, Self-Transcendence and Unity

1۔ مقدمہ

اسلامی تصوف کی روایت میں "عشقِ حقیقی" ایک مرکزی اور نہایت اہم تصور ہے جو انسان اور خالق کے تعلق کو سب سے بلند اور پاکیزہ درجے پر بیان کرتا ہے۔ صوفیاء کرام نے ہمیشہ یہ باور کرایا کہ انسانی زندگی کی اصل غایت اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ساتھ عشق میں فنا ہونا ہے۔ تصوف میں عشق کا مفہوم محض جذباتی وابستگی یا دنیوی محبت سے بالاتر ہے، بلکہ یہ وہ روحانی کیفیت ہے جس میں بندہ اپنے وجود کی حقیقت کو پہچان کر اس حقیقتِ مطلقہ میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ تصور قرآن و حدیث کے بنیادی مضامین سے ماخوذ ہے، جیسے کہ "یحبہم ویحبونہ" (اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں)۔ اسلامی تہذیب میں تصوف نے اس تصور کو شاعری، فلسفہ اور روحانیت کے مختلف میدانوں میں اس طرح پیش کیا کہ عشق کو انسان کی تکمیل کا سب سے اعلیٰ وسیلہ قرار دیا گیا۔ دوسری جانب، جدید فلسفۂ محبت انسانی ذہن و فکر کے ارتقائی سفر میں ایک نیا باب کھولتا ہے، جس میں محبت کو زیادہ تر نفسیاتی، سماجی اور وجودی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ جدید مفکرین کے نزدیک محبت نہ صرف انسانی رشتوں کی بنیاد ہے بلکہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو معاشرتی نظام، اخلاقی اقدار اور حتیٰ کہ انسان کے وجود کے معنی متعین کرتی ہے۔ چنانچہ اسلامی تصوف میں عشقِ حقیقی کے

روحانی اور الٰہیاتی پہلوؤں کو اگر جدید فلسفہ ٔمحبت کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کے ساتھ تقابلی انداز میں سمجھا جائے تو ایک نہایت بامعنی اور عمیق علمی گفتگو سامنے آتی ہے جو انسانی شعور کو نئے جہات سے روشناس کراتی ہے۔

موضوع کے انتخاب کی اہمیت

اس موضوع کے انتخاب کی اہمیت اس حقیقت سے جڑی ہوئی ہے کہ موجودہ دور میں انسانیت شدید فکری اور روحانی بحران کا شکار ہے۔ جدید سائنسی ترقی اور مادہ پرستانہ طرزِ زندگی نے اگرچہ بظاہر انسان کو سہولتیں فراہم کی ہیں لیکن اس کے نتیجے میں روحانی خلا، بے چینی، تنہائی اور اخلاقی زوال جیسے مسائل نے جنم لیا ہے۔ ان حالات میں صوفیاء کے پیش کردہ عشقِ حقیقی کا تصور انسان کو اپنے خالق کے ساتھ ربطِ باطنی قائم کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جو اس کے وجود کو مقصدیت عطا کرتا ہے۔ دوسری طرف، جدید فلسفہ ٔمحبت بھی ایک طرح سے انسانی وجود کے بحران کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ جدید فلسفیوں نے محبت کو ایک ایسی بنیادی قوت کے طور پر پیش کیا ہے جو نہ صرف ذاتی تعلقات بلکہ عالمی امن، انسان دوستی اور باہمی احترام کے اصولوں کی تشکیل کر سکتی ہے۔ لہٰذا یہ تقابلی مطالعہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح اسلامی تصوف میں عشقِ حقیقی کا نظریہ اور جدید فلسفہ ٔمحبت اپنے اپنے دائرے میں انسان کو ایک جامع اور بامقصد زندگی کی راہ دکھاتے ہیں۔ اس موضوع کی معنویت اس پہلو سے بھی اجاگر ہوتی ہے کہ یہ مطالعہ ماضی اور حال، روحانیت اور فلسفہ، مذہب اور جدیدیت کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کر سکتا ہے، جو نہ صرف علمی سطح پر تحقیق کرنے والوں کے لیے فائدہ مند ہے بلکہ عام قاری کے لیے بھی اپنی عملی زندگی میں رہنمائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح اس موضوع کا انتخاب محض علمی تجسس کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ عملی اور روحانی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔

تحقیق کے بنیادی سوالات، طریقہ کار اور حدود

اس تحقیق کے بنیادی سوالات میں یہ شامل ہیں کہ اسلامی تصوف میں عشقِ حقیقی کا کیا مفہوم ہے اور یہ کس طرح انسانی وجود کو خدا کی معرفت تک لے جاتا ہے؟ اس کے مقابلے میں جدید فلسفہ ٔمحبت کس طرح محبت کو انسانی تعلقات اور معاشرتی نظام کے تناظر میں بیان کرتا ہے؟ مزید یہ کہ دونوں تصورات میں کس حد تک ہم آہنگی یا تضاد پایا جاتا ہے، اور یہ کس طرح موجودہ انسانی مسائل کا حل فراہم کر سکتے ہیں؟ ان سوالات کی روشنی میں تحقیق کا طریقہ کار تقابلی اور تجزیاتی ہے، جس میں تصوف کے کلاسیکی ماخذات (قرآن، حدیث، صوفیاء کے اقوال و متون) کے ساتھ ساتھ جدید فلسفیوں کی تحریروں کا مطالعہ شامل کیا ہے۔ طریقہ کار میں معروضیت اور غیر جانب داری کو پیشِ نظر رکھا ہے تاکہ نتائج میں تحقیق کا توازن برقرار رہے۔ اس تحقیق کی حدود میں یہ امر شامل ہے کہ موضوع کی وسعت کے باوجود صرف بنیادی نکات پر روشنی ڈالی ہے اور تفصیلات میں جانے سے اجتناب کیا ہے۔ اس طرح یہ تحقیق ایک واضح اور مرکوز دائرے میں رہتے ہوئے اسلامی تصوف اور جدید فلسفہ کے مابین تقابلی مکالمے کو آگے بڑھائے ہے۔

2۔ تصوف کا تعارف

اسلامی تاریخ میں تصوف کا ارتقا

تصوف کا تاریخی ارتقا ابتدائی اسلامی صدیوں میں زہد و عبادت کی ایک سادہ تحریک کے طور پر شروع ہوا جو بعد میں ایک منظم روحانی، علمی اور ثقافتی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ ابتدائی دور میں صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے دنیاوی لذتوں سے احتیاز اور اللہ کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ مشغولیت کو اپنا شعار بنایا۔ یہی وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہیں تاریخ میں "زہاد" اور "عباد" کے نام سے جانا گیا اور جو تصوف کے بانیوں کے طور پر سامنے آئے۔ دوسری صدی ہجری میں جب اسلامی معاشرہ مادی طور پر پھیلا اور دولت و عیش کی فراوانی ہوئی، تو انہی حالات کے ردعمل کے طور پر ریاضت و مجاہدے پر مبنی ایک تحریک نے عراق، شام اور ایران میں زور پکڑا۔ اس دور کے نمایاں ترین figures میں ابراہیم بن ادھم، فضیل بن عیاض اور رابعہ بصری شامل ہیں، جنہوں نے محبت الٰہی اور للّٰہیت کے تصورات کو پروان چڑھایا۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تصوف بغداد کے مرکز میں ایک منظم علم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس دور میں جنید بغدادی جیسی ہستیوں نے تصوف کو شریعت کے دائرے میں رکھتے ہوئے اس کے نظریاتی اصولوں کو وضع کیا۔ جنید بغدادی کا قول تھا: "ہذا العلم مضبوط بأصول کتاب وسنتہ "یعنی یہ علم کتاب و سنت کی بنیادوں پر مضبوطی سے کھڑا ہے[1]۔ یہی وہ دور تھا جب تصوف پر پہلی مستند کتابیں لکھی گئیں، جن میں ابونصر سراج طوسی کی "اللمع فی التصوف" اور کلاباذی کی "التعرف لمذہب اہل التصوف" شامل ہیں، جنہوں نے تصوف کی تعریفات اور اصطلاحات کو مدون کیا۔ پانچویں صدی ہجری میں امام غزالی کی عظیم الشان تصنیف "احیاء علوم الدین" نے تصوف کو اسلامی علوم کے دائرے میں ایک ناقابل تردید مقام دلایا۔ غزالی نے ظاہری علوم اور باطنی احوال کے درمیان موجود خلیج کو پاٹا اور ثابت کیا کہ حقیقی کمال دونوں کے امتزاج سے حاصل

[1] ابو نعیم اصفہانی، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، جلد 10 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2002)، 255

ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے ادوار میں تصوف نے سلسلہ ہائے طریقت کی صورت میں ایک نئی شکل اختیار کی اور مختلف خطوں میں پھیل کر مقامی ثقافتوں سے ہم آہنگ ہو گیا۔ خاص طور پر جنوبی ایشیا میں چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ سلسلوں نے نہ صرف روحانی تعلیمات پھیلائیں بلکہ معاشرتی ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جدیدیت کے چیلنجز کے باوجود تصوف اپنی بنیادی تعلیمات کے ساتھ زندہ ہے اور جدید انسان کی روحانی پیاس بجھانے کا اہم ذریعہ بنا ہوا ہے[2]۔

تصوف کی بنیادی تعریفات اور اس کے مرکزی تصورات

تصوف کی تعریف مختلف ادوار میں مختلف صوفیاء نے اپنے ذوق و تجربے کی روشنی میں بیان کی ہے، لیکن ان تمام کا محور و مرکز در حقیقت "احسان" کا وہ قرآنی و نبوی تصور ہے جو حدیث جبریل میں بیان ہوا ہے۔ تصوف کو "حسن اخلاق" قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ مشہور صوفی بزرگ جنید بغدادی فرماتے ہیں: "التصوف استعمال كل خلق سني وترک كل خلق دني" یعنی تصوف ہر عمدہ خلق کو اپنانا اور ہر پست خلق کو ترک کرنا ہے[3]۔ ایک اور بنیادی تعریف کے مطابق تصوف "تزکیہ نفس" کا دوسرا نام ہے، یعنی نفس انسانی کو رذائل اور بری عادات سے پاک کر کے اسے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے لیے آمادہ کرنا۔ یہ تعریف در حقیقت قرآن پاک کی اس آیت کریمہ کی عملی تفسیر ہے: "قد أفلح من زكاها" (بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا)۔ تصوف کی ایک اہم تعریف "اخلاص" کے تصور سے بھی وابستہ ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "تصوف، شریعت کے ظاہری و باطنی احکام پر خلوص نیت کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ ہر عمل خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کرے، نہ کہ لوگوں کو دکھانے یا کسی دنیوی فائدے کے لیے۔ اسی طرح تصوف کی تعریف "فقر" اور "استغنا" کے تصورات سے بھی کی جاتی ہے، جس میں صوفی اللہ کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تصوف کے بنیادی تصورات میں "محبت الٰہی" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ صوفیاء کے نزدیک محبت ہی وہ قوت ہے جو بندے کو معبود حقیقی تک پہنچاتی ہے۔ رابعہ عدویہ پہلی صوفیہ تھیں جنہوں نے محبت الٰہی کے تصور کو واضح طور پر پیش کیا۔ دیگر اہم تصورات میں "مراقبہ"، "ذکر"، "شکر"، "صبر"، "توکل" اور "رضا" شامل ہیں۔ ہر تصور کا تعلق انسان کے باطنی سفر کے ایک خاص مرحلے سے ہے۔ تصوف کی راہ میں "شیخ" یا "مرشد" کی رہنمائی کو نہایت اہمیت حاصل ہے، کیونکہ مرشد ہی سالک کو راہ کے خطرات سے آگاہ کرتا اور اس کی روحانی تربیت کرتا ہے۔ تصوف کا مقصد نہ صرف فرد کی باطنی اصلاح ہے بلکہ اس کا مقصد انسان کو "انسان کامل" بنانا ہے، یعنی وہ انسان جو اپنے ظاہر و باطن میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی کامل نمائندگی کرتا ہو[4]۔

روحانی اصلاح اور معاشرتی تعمیر میں تصوف کا کردار

تصوف کا بنیادی ہدف فرد کے باطن کی تعمیر و تربیت ہے، جس کے بغیر ظاہری عبادات و اعمال کی حقیقی روح اور تاثیر باقی نہیں رہتی۔ تصوف کی رو سے محض ظاہری اعمال کی ادائیگی کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ وہ اعمال ایک پاکیزہ باطن، صاف دل اور مخلصانہ نیت سے سرزد ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام "تزکیہ نفس" اور "تصفیہ قلب" پر زور دیتے ہیں، یعنی نفس انسانی کو غرور، تکبر، حسد، بغض، ریا اور حب دنیا جیسی مہلک بیماریوں سے پاک کرنا اور اس کے متبادل کے طور پر عاجزی، انکساری، محبت، ایثار، صبر، شکر اور توکل جیسی عظیم صفات سے اسے آراستہ کرنا۔ اس طرح تصوف انسان کے اندر ایک ایسی داخلی نگرانی (مراقبہ نفس) کا نظام قائم کر دیتا ہے جس کی بدولت وہ ہر وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے (احسان)۔ چنانچہ وہ نہ صرف گناہوں کے ارتکاب سے بچتا ہے بلکہ نیکیوں کو ان کے اعلیٰ ترین معیار پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ روحانی اصلاح کے اس عمل کا ایک لازمی نتیجہ اخلاق حسنہ کا حصول ہے۔ تصوف کی تکمیل در حقیقت اخلاق حسنہ کی تکمیل ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی "مکمل اخلاق" کی تکمیل بتایا گیا ہے۔ جب فرد کی یہ اصلاح ہو جاتی ہے تو اس کے مثبت اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک صوفی صرف اپنی ذات کی اصلاح تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ خلق خدا کی خدمت اور ان کی رہنمائی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ تاریخ اسلام میں صوفیاء کرام ہی وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے نہ صرف اسلام کی اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا بلکہ معاشرے میں رواداری، باہمی محبت اور اخوت کا درس دیا۔ ان کی خانقاہیں علم و اخلاق کے مراکز ہوا کرتی تھیں، جہاں بلا امتیاز رنگ و نسل لوگ فیض حاصل کرنے آتے تھے۔ تصوف انسان کو صرف اللہ ہی سے محبت کرنا نہیں سکھاتا بلکہ اس کی مخلوق سے محبت کرنا بھی سکھاتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے سے نفرتیں، تعصبات اور دیگر برائیاں ختم ہوتی ہیں۔ جدید دور میں جب کہ انسان مادی ترقی کے باوجود روحانی طور پر

---

[2] آن ماری شمل، اسلام کا صوفیانہ پہلو، ترجمہ ڈاکٹر سید ہاشم فرید، (لاہور: مکتبہ خیابان، 2010)، 75

[3] علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب، (لاہور: اسلامی اکادمی، 2009)، 63

[4] ڈاکٹر طاہر القادری، تصوف: علم و عمل، (لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، 2006)، 118

تہی دامن ہے، تصوف کی تعلیمات اس کے لیے سکون قلب کا باعث بن سکتی ہیں۔ تصوف کا پیغام محبت، امن اور رواداری کا پیغام ہے، جو آج کے متشدد اور تقسیم در تقسیم دنیا میں نہایت اہمیت کا حامل ہے[5]۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف فرد اور معاشرے دونوں کی اصلاح کا ایک جامع اور موثر پروگرام پیش کرتا ہے، جو انسان کو ظاہری و باطنی دونوں اعتبار سے کمال تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

3۔ عشقِ حقیقی کی بنیادیں

قرآن میں محبتِ الٰہی کا تصور

عشقِ حقیقی کی پہلی اور بنیادی اینٹ قرآن مجید میں محبتِ الٰہی کا واضح تصور ہے۔ قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان محبت کے رشتے کو دوطرفہ قرار دیا ہے، جہاں اللہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور بندے اپنے رب سے محبت کے تعلق میں بندھے ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ" (آل عمران: 31) یعنی "کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔ اس آیت مبارکہ میں محبت کی شرط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر رکھی گئی ہے، جو عشقِ حقیقی کی راہ کا پہلا اصول ہے۔ اسی طرح سورہ البقرہ کی آیت 165 میں مومنوں کی صفت بیان کی گئی ہے: "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ" یعنی "اور ایمان والے اللہ کی محبت میں سب سے سخت ہیں" [قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت: 165]۔ مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ محبتِ الٰہی ہی وہ بنیاد ہے جس پر ایمان کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ محبت کا یہ تعلق صرف جذباتی وابستگی کا نام نہیں، بلکہ اس کے تقاضوں میں اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرنا، اس کے احکام پر سر تسلیم خم کرنا اور ہر حال میں اس پر بھروسہ کرنا شامل ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے حقدار لوگوں کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں، جیسے کہ توبہ کرنے والے، پاک رہنے والے، صبر کرنے والے، اور انصاف پر قائم رہنے والے [قرآن مجید، سورہ المائدہ، آیت: 54]۔ یہ محبت ہی ہے جو بندے کو عبادات میں sincerity (اخلاص) عطا کرتی ہے، جس سے ریاکاری ختم ہوتی ہے اور عمل قبولیت کا درجہ پاتے ہیں۔ محبت کے بغیر عبادت بوجھ محسوس ہوتی ہے، جبکہ محبت کے ساتھ وہی عبادت روح کی غذا بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام نے ابتدا ہی سے اپنے سلوک کی بنیاد اسی قرآنی تصورِ محبت پر رکھی ہے [امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 298]۔

حدیث میں عشقِ رسول ﷺ اور محبتِ الٰہی

عشقِ حقیقی کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے میں احادیث مبارکہ نے مرکزی کردار ادا کیا ہے، جنہوں نے محبتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ عشقِ رسول کو ایمان کا لازمی جزو قرار دیا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ" یعنی "تین باتیں جس میں ہوں، اس نے ایمان کی مٹھاس پالی: وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول اسے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں، وہ شخص جو کسی بندے سے محبت صرف اللہ کے لیے کرے، اور وہ شخص جو کفر میں لوٹنے کو ایسے ہی ناپسند کرے جیسے آگ میں پھینکے جانے کو"[6]۔ یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ محبتِ الٰہی و رسولی ایمان کا ذائقہ ہے، اور اس کے بغیر ایمان نامکمل رہتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ایمان کی شرط ہی یہ رکھی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر محبوب سے زیادہ عزیز ہوں: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ" یعنی "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس کے باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"[7]۔ ان احادیث سے یہ درس ملتا ہے کہ عشقِ حقیقی کی راہ میں محبتِ رسول کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ آپ ہی کے ذریعے محبتِ الٰہی تک پہنچنا ممکن ہے۔ محبتِ رسول کا تقاضا ہے کہ بندہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی کامل پیروی کرے، آپ کے اسوہ حسنہ کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے اور ہر معاملے میں آپ کی اطاعت کو اولیت دے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اللہ کے قرب کا حق دار بنتا ہے۔

صوفیا کے نزدیک عشق کی حقیقت

[5] ڈاکٹر محمد اجمل، تصوف اور جدید انسان، (کراچی: اردو اکادمی سندھ، 2015)، 92

[6] امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان (بیروت: دار ابن کثیر، 2002)، 52

[7] امام مسلم، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ الرسول ﷺ (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2000)، 67

صوفیاء کرام نے عشقِ حقیقی کو معرفتِ الٰہی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عشق کوئی جذبہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو سالک کے وجود کو اللہ کی محبت میں اس طرح ڈھال دیتی ہے کہ پھر اس کی کوئی خودی باقی نہیں رہتی۔ مشہور صوفی بزرگ شیخ ابوالحسن خرقانی فرماتے ہیں: "عشق وہ آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے"[8]۔ صوفیاء کے ہاں عشق مجازی کو عشق حقیقی کی سیڑھی سمجھا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے میں رہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ایک چنگاری سے بڑی آگ لگ سکتی ہے، اسی طرح اگر مجازی محبت کو صحیح رخ مل جائے تو وہ آگے چل کر حقیقی محبت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ، جو محبت الٰہی کی علمبردار ہیں، ان کا قول ہے: "میں نے آگ کو جہنم کی وجہ سے نہیں اور جنت کی طمع سے نہیں، بلکہ صرف تیری رضا کے لیے عبادت کی ہے"[9]۔ یہ بات عشق کی اس بلند ترین منزل کو ظاہر کرتی ہے جہاں بندہ ثواب کے لالچ یا عذاب کے خوف کے بغیر، صرف اور صرف محبت میں ڈوب کر اپنے رب کی عبادت کرتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک عشق کی انتہا "فنا فی اللہ" ہے، جہاں سالک اپنی انا، اپنی خواہشات، غرض اپنی پوری ذات کو محبوب حقیقی کی ذات میں فنا کر دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر بندہ اپنے رب کے اوصاف سے متصف ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں: "عشق کی حقیقت دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو مکمل طور پر محبوب کے ذکر اور اس کی طرف رغبت میں مشغول ہو"[10]۔ اس طرح صوفیاء کا مکتب فکر عشق کو نہ صرف ایک جذبہ بلکہ ایک عملی سفر قرار دیتا ہے، جس کے ذریعے بندہ اپنے خالق حقیقی سے جاملتا ہے۔

4۔ عشقِ حقیقی کے مراتب

عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا سفر

عشقِ حقیقی تک پہنچنے کی راہ میں عشقِ مجازی کو ایک اہم روحانی وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ صوفیاء کرام کے نزدیک عشقِ مجازی، اگر شرعی حدود میں رہ کر پایا جائے، تو عشقِ حقیقی کی طرف ایک قدم ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ محبت کی جو فطری صلاحیت انسان میں ودیعت کی گئی ہے، اس کا ابتدائی اظہار کسی مخلوق سے وابستہ ہو سکتا ہے، لیکن اس کا حتمی ہدف ذاتِ باری تعالیٰ ہی ہونا چاہیے۔ مشہور صوفی بزرگ شیخ فریدالدین عطار اپنی شہرہ آفاق کتاب "منطق الطیر" میں اس سفر کی تمثیل پیش کرتے ہیں، جہاں پرندوں کی مختلف کیفیات درحقیقت سالک کے مختلف مراحل کی علامت ہیں[11]۔ عشقِ مجازی درحقیقت عشقِ حقیقی کے لیے ایک طرح کی ریاضت اور تیاری کا درجہ رکھتا ہے، جہاں انسان محبت کے تقاضوں، قربانی اور وفا کے معانی سیکھتا ہے۔ امام غزالی "احیاء علوم الدین" میں اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "دنیاوی محبت کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دریا کے کنارے کھڑا ہو کر پانی کی پیاس بجھاتا ہے، جبکہ حقیقی محبت اس شخص کی مانند ہے جو خود دریا میں اتر جاتا ہے"[12]۔ اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ عشقِ مجازی ایک محدود اور بالواسطہ تجربہ ہے، جبکہ عشقِ حقیقی ایک لامحدود اور بلاواسطہ حصول کا نام ہے۔ اس سفر کا اہم نکتہ یہ ہے کہ سالک محبت کے جذبات کو پاکیزہ رکھتے ہوئے ان کا رخ مخلوق سے ہٹا کر خالق کی طرف موڑ دے۔ جب سالک یہ دیکھتا ہے کہ مخلوق کی محبت میں بھی اصل کشش درحقیقت اس کے خالق کی دی ہوئی خوبصورتی اور صفات کا عکس ہے، تو اس کی نظر مجازی محبوب سے ہٹ کر حقیقی محبوب تک جا پہنچتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس تبدیلی کے بعد سالک کے لیے ہر چیز میں محبوب حقیقی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے اور اس کا سارا وجود محبت الٰہی میں ڈوب جاتا ہے۔

فنافی اللہ اور بقاباللہ کے درجات

عشقِ حقیقی کی راہ کے دو انتہائی اہم اور اعلیٰ مراتب "فنا فی اللہ" اور "بقاباللہ" ہیں۔ "فنا فی اللہ" سے مراد سالک کا اپنی انا، اپنی مرضی اور اپنی خودی کو محبوب حقیقی کی ذات و صفات میں اس طرح فنا کر دینا ہے کہ اس کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنے عمل اور اپنی عبادت کو بھی بھول جاتا ہے اور اسے صرف محبوب ہی کی ذات نظر آتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامی کے اس قول میں اس کی واضح مثال ملتی ہے: "سبحانی! ما اعظم شانی" یعنی "پاک ہے میری ذات! میرا شان کتنا عظیم ہے"۔ صوفیاء کی تشریح کے مطابق یہ درحقیقت "فنا" کے انتہائی مقام پر پہنچ کر ذاتِ الٰہی کے ساتھ اس کی اس طرح وحدت کا اعلان تھا کہ اپنی انا مٹ چکی تھی[13]۔ "فنا" کے اس

---

[8] علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب (لاہور: اسلامی اکادمی، 2009)، 412

[9] فاریدالدین عطار، تذکرۃ الاولیاء (قم: انصاریان، 2001)، 68

[10] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 305

[11] فریدالدین عطار، منطق الطیر، (لاہور: مکتبہ عالیہ، 2005)، 112

[12] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 320

[13] علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب (لاہور: اسلامی اکادمی، 2009)، 245

مقام کے بعد "بقاباللہ" کا درجہ آتا ہے۔ "بقاباللہ" سے مراد یہ ہے کہ جب سالک کی اپنی ذات فنا ہو جاتی ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے، جس میں وہ اللہ کی صفات کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ یعنی اب اس کا دیدار، اس کا کلام اور اس کا عمل اللہ کی مشیت کے تابع ہوتا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے ان مراتب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "فنا ایک طرح کی بے ہوشی کی حالت ہے، جبکہ بقا ہوش و ہوشیاری کے ساتھ اللہ کے ساتھ قائم رہنے کا نام ہے"[14]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "فنا" میں سالک اپنے آپ کو کھو دیتا ہے، لیکن "بقا" میں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوبارہ وجود عطا ہوتا ہے، مگر اس بار اس کا یہ وجود اللہ کی صفات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے "عقبے کی معرفت" بھی کہا جاتا ہے، جہاں سالک اللہ کے اوصاف حمیدہ سے متصف ہو کر خلق خدا کی خدمت کے لیے موثر کردار ادا کرتا ہے۔

سالک کی روحانی منازل میں عشق کا کردار

عشقِ حقیقی سالک کے روحانی سفر میں وہ محرک قوت ہے جو اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچاتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو سالک کو ابتدائی منزل "تصفیہ" (تزکیہ نفس) پر آمادہ کرتا ہے، جہاں وہ اپنے نفس کو رذائل اخلاق سے پاک کرتا ہے۔ پھر یہی عشق اسے "تزکیہ" (نفس کو نیکیوں سے آراستہ کرنے) کی منزل تک لے جاتا ہے۔ اس کے بعد کی منزلیں "تجلی" (اللہ کے انوار کا مشاہدہ) اور "وصال" (اللہ سے ملاقات) کی ہیں، جن تک پہنچنے کا واحد ذریعہ سچا عشق ہی ہے۔ ہر منزل پر عشق کا کردار اور ظہور مختلف ہوتا ہے۔ ابتدائی منازل میں عشق ایک تڑپ اور جستجو کی شکل میں ہوتا ہے، جبکہ آخری منازل میں یہ اطمینان اور وصال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا رومی مثنوی میں عشق کی اس محرک قوت کے بارے میں فرماتے ہیں: "عشق وہ ہے جو ہر چیز کو جلا دیتا ہے، اور ہر بندے کو سوختن (فنا ہونے) کا ہنر سکھاتا ہے"[15]۔ عشق سالک کے لیے استاد کی مانند ہے جو اسے ہر منزل کے آداب سکھاتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو سالک کو صبر کی تلقین کرتا ہے جب وہ آزمائشوں سے گزر رہا ہوتا ہے، یہ عشق ہی ہے جو اسے شکر گزار بناتا ہے جب اس پر انعامات ہوتے ہیں، اور یہ عشق ہی ہے جو اسے توکل کی راہ دکھاتا ہے جب وہ بظاہر لاچار ہوتا ہے۔ شیخ سعدی نے "گلستان" میں لکھا ہے "عاشق کے لیے جہاں کہیں بھی محبوب نظر آئے، وہیں اس کا وطن ہے"[16]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عشق سالک کو ہر حال اور ہر مقام میں محبوب کی تلاش اور اس کے دیدار میں مصروف رکھتا ہے، چنانچہ اس کے لیے کوئی جگہ اجنبی نہیں رہتی۔ اس طرح عشقِ حقیقی سالک کی روحانی منازل کا ہر قدم ہر لمحہ اس کا رہبر و رہنما ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

5۔ صوفیا کے نزدیک عشق کی علامات

رضا بالقضا اور صبر

صوفیاء کرام کے نزدیک عشقِ حقیقی کی پہلی اور بنیادی علامت "رضا بالقضا" یعنی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا اور ہر آزمائش پر صبر کرنا ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو بندے کو اس کی خودی اور انا سے مکمل طور پر پاک کر کے محبوب حقیقی کی مرضی کے تابع کر دیتی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک رضا در حقیقت ایمان کی اس انتہا کا نام ہے جہاں بندہ نہ صرف اللہ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے بلکہ اسے ہر حال میں اچھا سمجھتا ہے، خواہ وہ ظاہری طور پر اس کے حق میں ہو یا اس کے خلاف۔ حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ کی بندگی کی سب سے بلند چیز صبر اور رضا ہے"[17]۔ یہی وہ مقام ہے جسے امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں اپنے آخری کلمات میں بیان فرمایا "تیرے فیصلے پر راضی ہوں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں اے فریاد رسی کرنے والوں کے فریاد رس"[18]۔ صبر اور رضا در حقیقت عشق کے دو پہلو ہیں۔ صبر آزمائش کے وقت ثابت قدمی کا نام ہے، جبکہ رضا اس سے آگے کی منزل ہے جہاں بندہ ہر حال میں اللہ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتا ہے۔ صوفیاء سمجھتے ہیں کہ جب تک بندہ اپنی مرضی اور خواہشات کو اللہ کی مرضی کے آگے قربان نہیں کرتا، اس کا عشق ادھورا رہتا ہے۔ رضا کی علامت یہ ہے کہ بندہ نعمت ملنے پر شکر ادا کرے اور مصیبت آئے تو صبر کرے، اور دونوں حالات میں اس کا دل اللہ کی رضا پر مطمئن رہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے

---

[14] امام ربانی، مکتوبات امام ربانی، جلد 1 (کراچی: مکتبہ مدینہ، 2007)، 88

[15] مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر اول (استنبول: نشر فرهنگ، 2010)، 156

[16] شیخ سعدی، گلستان سعدی، باب ہشتم (تہران: امیر کبیر، 2008)، 92

[17] علی بن موسی الرضا، فقہ الرضا، (قم: مؤسسہ امام رضا، 2006)، 359

[18] سید محمد جواد مقرم، مقتل الحسین، (بیروت: دار المحجۃ البیضاء، 2000)، 367

"نفس مطمئنہ" کہا جاتا ہے، جس کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے" :یَا أَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِی إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً[19]"۔ صوفیاء کے نزدیک عشق کی راہ میں آنے والی ہر مشکل درحقیقت محبوب کی طرف سے ایک تحفہ ہے جو عاشق کے درجے کو بلند کرتی ہے۔

ذکر و فکر کی کثرت

عشقِ حقیقی کی دوسری واضح علامت ذکر و فکر کی کثرت ہے۔ صوفیاء کے نزدیک ذکر محبوب کا نام لینا اور فکر اس کے تصور میں محو رہنا عشق کی جان ہے۔ ذکر کی کثرت سے مراد صرف زبان سے تسبیحات پڑھنا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ عاشق کا دل ہر وقت محبوب کے نام سے جاری و ساری رہے، چاہے اس کی زبان حرکت کر رہی ہو یا نہ کر رہی ہو۔ ایک مشہور صوفی بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک صوفی کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ ایک دن شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے ذکر کا جواب اللہ کی طرف سے نہیں آتا۔ اس وسوسے کی وجہ سے اس صوفی نے ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ پھر خواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے اسے بتایا کہ "تمہارا ذکر میں مشغول ہونا ہی تمہارے ذکر کی قبولیت کی دلیل ہے۔ تمہارے دل میں جو سوز و گداز ہے اور میری چاہت و محبت ہے، یہی تمہارے ذکر کی قبولیت کی نشانی ہے[20]"۔ ذکر کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ بندہ خود بخود ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ فکر کی کثرت سے مراد یہ ہے کہ عاشق کا دل ہر وقت محبوب کے تصور اور اس کی ذات کے گہرے غور و فکر میں غرق رہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں" :فکر قلب کی وہ حرکت ہے جو معانی کو گردش دے کر مطلوب حق تک پہنچاتی ہے[21]"۔ صوفیاء کے نزدیک ذکر و فکر کا باہمی گہرا تعلق ہے۔ ذکر فکر کو جنم دیتا ہے اور فکر ذکر کو گہرائی عطا کرتی ہے۔ یہ دونوں مل کر عاشق کے دل سے دنیاوی محبتوں کو نکال کر اسے محبوب حقیقی کی محبت سے معمور کر دیتے ہیں۔ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں، مثلاً ذکرِ جلی (زبان سے اذکار پڑھنا) اور ذکرِ خفی (دل کے اندر محبوب کو یاد کرنا) صوفیاء کی نظر میں ذکرِ خفی ذکرِ جلی سے افضل ہے، کیونکہ یہ دل کی کیفیت سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ فکر کی انتہا یہ ہے کہ بندہ ہر چیز میں محبوب کی نشانیاں دیکھنے لگے اور ہر شے اسے محبوب کی طرف رغبت دلاتی ہوئے محسوس ہو۔

دنیا سے بے رغبتی اور قربِ الٰہی کی چاہ

عشقِ حقیقی کی تیسری اہم علامت دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبتی اور قربِ الٰہی کی شدید خواہش ہے۔ صوفیاء کرام کے نزدیک جب تک بندے کے دل میں دنیا کی محبت ہوتی ہے، وہ محبوب حقیقی کی محبت کے لیے جگہ نہیں بنا سکتا۔ دنیا سے بے رغبتی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان دنیا کو بالکل ترک کر دے، بلکہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو صرف ایک پل کے طور پر استعمال کرے، اسے اپنا مقصد نہ بنائے۔ حضرت بایزید بسطامی کا قول ہے" :عارف وہ ہے جسے دنیا اور اس میں جو کچھ ہے، اس حال میں محبوب ہو جیسے تمہیں پتھر محبوب ہیں[22]"۔ یعنی جس طرح پتھر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، اسی طرح عارف کے نزدیک دنیا اور اس کی تمام متاع بے قیمت ہوتی ہے۔ دنیا سے بے رغبتی کے بغیر قربِ الٰہی کی حقیقی چاہ پیدا نہیں ہو سکتی۔ قربِ الٰہی کی چاہ درحقیقت عشق کی معراج ہے، جہاں عاشق ہر چیز کو چھوڑ کر صرف محبوب کی طرف دوڑتا ہے۔ یہ چاہ اسے ہر وقت بے چین اور بے قرار رکھتی ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں" :سالک کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کا دل ہر وقت قربِ الٰہی کی تلاش میں بے قرار رہتا ہے اور وہ ہر اس چیز سے منہ موڑ لیتا ہے جو اسے اللہ سے غافل کرے[23]"۔ صوفیاء کے نزدیک دنیا سے بے رغبتی اور قربِ الٰہی کی چاہ درحقیقت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جب دل سے دنیا کی محبت نکلتی ہے تو اس کی جگہ خود بخود اللہ کی محبت آ جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر بندہ سچے عشق کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

6۔ نمایاں صوفیانہ افکار میں عشقِ حقیقی

حضرت رابعہ بصری کا نظریۂ عشق

تصوف کی تاریخ میں حضرت رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہا کا نام عشقِ حقیقی کے ایسے خالص اور بے مثال تصور کے ساتھ وابستہ ہے جس نے محبت الٰہی کو ہر دنیاوی غرض اور جزا و سزا کے حساب سے بالاتر قرار دیا۔ آپ نے عبادت و بندگی کو جنت کی لالچ اور دوزخ کے خوف سے نکال کر صرف اور صرف اللہ کی محبت کی بنیاد پر استوار کیا۔ آپ کے نظریہ عشق کی سب سے واضح علامت وہ واقعہ ہے جب آپ کو بصرہ کی گلیوں میں ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی لے جاتے دیکھا گیا۔ لوگوں کے

---

[19] سورہ الفجر

[20] مولانا جلال الدین رومی، حکایات رومی، (استنبول: نشر فرھنگ، 2010)، 117

[21] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 45

[22] فرید الدین عطار، تذکرۃ الاولیاء، (قم: انصاریان، 2001)، 68

[23] امام ربانی، مکتوبات امام ربانی، جلد 1 (کراچی: مکتبہ مدینہ، 2007)، 155

پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ "میں جنت کو جلانا اور دوزخ کو بجھانا چاہتی ہوں، تاکہ لوگ نہ تو جنت کی طمع میں عبادت کریں اور نہ ہی دوزخ کے ڈر سے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی محبت کے لیے عبادت کریں[24]"۔ یہ بیان در حقیقت عشق حقیقی کی اس انتہا کو ظاہر کرتا ہے جہاں عاشق کے دل میں محبوب کے سوا کسی اور چاہت یا خوف کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ رابعہ بصری کی محبت میں "للّٰہیت" کا element اس قدر غالب تھا کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ شیطان سے نفرت کرتی ہیں، تو ان کا جواب تھا کہ "خدا کی محبت نے میرے دل میں اتنی جگہ بھی نہ چھوڑی کہ اس میں کسی اور کی نفرت سمائے[25]"۔ ان کے ہاں عشق کی یہ کیفیت محض ایک جذبہ نہیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے ان کے تمام ظاہری و باطنی احوال کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کرتیں، دن بھر روزہ سے رہتیں، اور ہمیشہ اللہ کے ذکر و فکر میں مصروف رہتیں۔ ان کی زندگی فقر و فاقہ میں گزری، لیکن انہوں نے کبھی اس پر شکوہ نہیں کیا، بلکہ ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہیں۔ ان کا یہی عشق ان کے لیے دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر تھا۔ امام غزالی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" میں حضرت رابعہ کے نظریہ عشق کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "رابعہ بصری نے اپنے اشعار میں غرض اور آرزو کی جس بحث کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا احسان اور انعام ہے... اور جس حب الٰہی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد دیدار الٰہی اور جمال خداوندی ہے اور یہی محبت سب سے بہتر اور برتر ہے[26]"۔ اس طرح حضرت رابعہ بصری کا نظریہ عشق ایک ایسی بلند ترین منزل کی نشاندہی کرتا ہے جہاں عبادت کا محرک خالصتاً محبت ہوتی ہے، نہ کہ کسی دنیوی یا اخروی فائدے کا حصول۔

مولانا روم کی مثنوی میں عشق

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی در حقیقت عشق حقیقی کا ایک بحر بیکراں ہے، جس کا ہر شعر عشق کی حرارت اور وجدانی کیفیت سے معمور ہے۔ مولانا کے نزدیک عشق کوئی ذہنی یا فلسفیانہ تصور نہیں، بلکہ ایک زندہ اور متحرک قوت ہے جو کائنات کی ہر شے میں کارفرما ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "عشق وہ آگ ہے جو نَی میں ہے، عشق کی ہی جوشش ہے جو مے میں ہے[27]"۔ ان کے نزدیک عشق ہی وہ بنیادی محرک ہے جو جمادات کو نباتات، نباتات کو حیوانات اور حیوانات کو انسان بناتا ہے، اور پھر انسان کو اس کی منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ مولانا عشق کو عقل کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ عقل محض ظاہری چیزیں دیکھتی ہے، جبکہ عشق باطن کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "عقل آنکھوں سے دیکھتی ہے، عشق بے چشم بھی دیدار کر لیتا ہے[28]"۔ مولانا کے ہاں عشق کی ایک اہم علامت "فنا" کا تصور ہے۔ عاشق اپنی انا، اپنی خواہشات، غرض اپنی پوری ذات کو محبوب حقیقی کی ذات میں فنا کر دیتا ہے۔ یہی فنا در حقیقت "بقا" کا باعث بنتی ہے۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ عشق کے بغیر روح کی کوئی پرواز ممکن نہیں ہے۔ عشق ہی وہ پر ہے جو روح کو بلندیوں کی طرف اڑاتا ہے۔ ان کا مشہور قول ہے کہ "تمہاری روح کے پر ہیں عشق کے سوا، عشق ہی کے ذریعے تو آسمانوں پر جا سکتا ہے[29]"۔ مولانا روم کے نزدیک عشق ہی وہ کیمیا ہے جو انسان کو انسان کامل بناتی ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو بندے اور اس کے رب کے درمیان حائل تمام پردوں کو ہٹا دیتا ہے اور وصل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ان کے افکار میں عشق کا یہ رزمیہ اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہے کہ ہر دور کا صاحب دل اس سے اپنی گھٹی کی پیاس بجھاتا آیا ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

ابن عربی کا وحدت الوجود اور عشق

محی الدین ابن عربی کا نظریہ وحدت الوجود در حقیقت عشق حقیقی کی ایک MeT افیزیکی (ماورائی) تشریح پیش کرتا ہے، جس کے مطابق ساری کائنات محبوب حقیقی کی تجلیات کا مظہر ہے۔ ابن عربی کے نزدیک عشق ہی وہ بنیادی قوت ہے جس نے کائنات کو حرکت میں لایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "خداوند تعالیٰ مخفی خزانہ تھا، چاہا کہ پہچانا جائے، پس اس نے کائنات کو پیدا کیا[30]"۔ صوفیاء کی تشریح کے مطابق یہ "چاہنا" در حقیقت عشق ہی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ذات باری نے اپنے جمال و کمال کے ظہور کے لیے جو چاہت پیدا کی، وہی عشق تھا جو تخلیق کائنات کا محرک بنا۔ ابن عربی کے نظام فکر میں "حقیقت محمدیہ" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جو کائنات کی علت غائی اور محبوب

---

[24] فرید الدین عطار، تذکرۃ الاولیاء، (قم: انصاریان، 2001)، 68
[25] جاوید چ، عشق الٰہی اور حضرت رابعہ بصریؒ، (جاوید چ ڈاٹ کام، 2017)، آن لائن
[26] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 312
[27] مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر اول، (استنبول: نشر فرہنگ، 2010)، 24
[28] مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر دوم، (استنبول: نشر فرہنگ، 2010)، 158
[29] مولانا جلال الدین رومی، فیہ مافیہ، (تہران: امیر کبیر، 2005)، 92
[30] ابن عربی، فصوص الحکم، (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 56

حقیقی کی پہلی تجلی ہے۔ ان کے مطابق "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سب سے پہلے وجود میں آئی اور سب سے آخر میں آپ کا ظہور ہوا ہے[31]"۔ اس طرح عشق کا سفر در حقیقت اسی حقیقت محمدیہ کی طرف واپسی کا سفر ہے۔ ابن عربی کے ہاں عشق کا یہ سفر فردی نہیں بلکہ کائناتی ہے۔ ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹنے کے لیے بے تاب ہے اور یہی بے تابی در حقیقت عشق ہے۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ مخلوق کی محبت در حقیقت خالق کی محبت ہی کی ایک شکل ہے، کیونکہ ہر چیز اسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ان کے نزدیک عارف وہ ہے جو ہر شے میں محبوب حقیقی کے جمال کے جلوے دیکھتا ہے۔ یہی وحدت الوجود کا نظریہ ہے، جس کے مطابق وجود در حقیقت ایک ہے اور وہ ذات باری تعالیٰ کا وجود ہے، باقی سب اس کی مختلف صورتیں اور مظاہر ہیں۔ اس نظریے کے تحت عشق کی حقیقت یہ ہے کہ عاشق در حقیقت محبوب ہی سے عشق کر رہا ہے، اور محبوب در حقیقت اپنی ہی ذات کے جمال و کمال پر فریفتہ ہے۔ یہی وہ عرفانی بصیرت ہے جو ابن عربی کے افکار کو عشق حقیقی کے باب میں ایک منفرد اور عمیق مقام عطا کرتی ہے۔

7۔ جدید فلسفہ محبت کا تعارف

یونانی فلسفے میں محبت کے نظریات(Eros, Agape, Philia)

یونانی فلسفہ محبت کے تصور کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے، جہاں محبت کو تین بنیادی اقسام میں تقسیم کیا گیا: ایروس(Eros)، اگرپی(Agape)، اور فِلیا(Philia)۔ ایروس جنسی محبت، جسمانی کشش اور رومانوی جذبے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی محبت ہے جو خوبصورتی اور خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ افلاطون نے اپنے مکالمے 'سمپوزیم' میں ایروس کی وضاحت ایک ایسی قوت کے طور پر کی ہے جو انسان کو جسمانی خوبصورتی سے شروع ہو کر روحانی خوبصورتی تک لے جاتی ہے[32]۔ دوسری قسم اگرپی ہے، جو ایک غیر مشروط، قربانی دینے والی اور روحانی محبت ہے۔ یہ محبت دینے پر مرکوز ہے نہ کہ لینے پر، اور یہ اکثر خدائی یا مذہبی محبت سے وابستہ ہے۔ سی ایس لِوس نے اپنی کتاب 'دی فور لووز' میں اگرپی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ وہ محبت ہے جو انسانی فطرت سے بالاتر ہے، یہ خدائی بخشش ہے"[33]۔ تیسری قسم فِلیا ہے، جو دوستی، عقیدت اور بھائی چارے کی محبت ہے۔ یہ باہمی احترام، مشترکہ مقاصد اور گہری وابستگی پر مبنی ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب 'نکوماشیئن ایتھکس' میں فِلیا کو سماجی تعلقات کی بنیاد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ "دوستی ایک ایسی روح ہے جو دو جسموں میں بستی ہے[34]"۔ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا کہ حقیقی محبت ان تینوں اقسام کا متوازن امتزاج ہے، جو انسان کو مکمل طور پر ترقی یافتہ اور متوازن فرد بننے میں مدد دیتی ہے۔ ان تصورات نے نہ صرف مغربی فلسفہ بلکہ عالمی ادب اور نفسیات کو گہرائی سے متاثر کیا ہے۔

جدید مغربی فلسفہ میں محبت

جدید مغربی فلسفہ میں محبت کے تصور نے ارسطو اور افلاطون کے کلاسیکی نظریات سے آگے بڑھ کر زیادہ پیچیدہ اور تنقیدی شکل اختیار کی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے فلسفیوں نے محبت کو معاشرتی طاقت کے ڈھانچے، وجودیاتی ضروریات، اور نفسیاتی محرکات کے تناظر میں دیکھا۔ ژاں پال سارتر نے محبت کو "دوسرے کے جذب ہونے کی خواہش" کے طور پر دیکھا، جہاں محبت کا رشتہ آزادی اور قبضے کے درمیان ایک تنازعہ بن جاتا ہے[35]۔ سارتر کے نزدیک محبت اپنے آپ کو دوسرے کے ذریعے تسلیم کروانے کی ایک کوشش ہے، جو اکثر ناکام رہتی ہے۔ اس کے برعکس، مارٹن بوبر نے اپنی کتاب 'آئی اینڈ Thou' میں ایک مثبت نقطہ نظر پیش کیا، جس میں انہوں نے 'I–Thou' کے تعلق پر زور دیا۔ بوبر کے مطابق، حقیقی محبت ایک باہمی تعلق ہے جہاں دو افراد ایک دوسرے کو مکمل طور پر تسلیم کرتے اور قبول کرتے ہیں، نہ کہ استعمال کرتے ہیں[36]۔ یہ تعلق سطحی نہیں بلکہ گہرا وجودی رابطہ ہے۔ ایک اور اہم فلسفی ایرک فروم ہیں، جنہوں نے اپنی مشہور کتاب 'دی آرٹ آف لوونگ' میں محبت کو ایک فعال قوت کے طور پر پیش کیا۔ فروم کے مطابق محبت صرف ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک عمل ہے، جس میں دیکھ بھال، ذمہ داری، احترام اور علم شامل ہیں[37]۔ ان کا کہنا

---

[31] ابن عربی، شجرۃ الکون، (قاہرہ: مکتبہ الثقافیہ الدینیہ، 1998)، 112

[32] افلاطون، سمپوزیم، ترجمہ بینجامن جوویت، (لندن: پینگوئن کلاسکس، 2003)، 47

[33] سی ایس لِوس، دی فور لووز، (نیویارک: ہارپر کولنز، 1960)، 121

[34] ارسطو، نکوماشیئن ایتھکس، کتاب VIII، ترجمہ ڈیوڈ راس، (آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2009)، 115

[35] ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسانی جذبات، ترجمہ برنیس فرٹ، (نیویارک: فلسفاتی لائبریری، 1957)، 89

[36] مارٹن بوبر، آئی اینڈ Thou، ترجمہ رونلڈ گریگ اسمتھ، (نیویارک: چارلس سکریبنر زسنز، 1958)، 56

[37] ایرک فروم، دی آرٹ آف لوونگ، (نیویارک: ہارپر اینڈ رو، 1956)، 78

تھا کہ محبت ایک ہنر ہے جسے سیکھا اور تیار کیا جا سکتا ہے۔ جدید فلسفہ محبت کو ایک جامع انسانی تجربے کے طور پر دیکھتا ہے جو وجود، معاشرہ اور اخلاقیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

سوشیالوجی اور نفسیات میں محبت کا تصور

سوشیالوجی اور نفسیات میں محبت کا مطالعہ ایک سائنسی اور تجرباتی بنیاد پر کیا جاتا ہے، جس کا مقصد محبت کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھنا ہے۔ نفسیات میں، محبت کو اکثر جذبات، وابستگی، اور تعلقات کے نظریات کے ذریعے سمجھا جاتا ہے۔ جان بولبی کا 'وابستگی کا نظریہ' اس سمجھ کی بنیاد ہے۔ بولبی کا کہنا تھا کہ بچپن میں بننے والے attachment bonds (وابستہ بندھن) بالغ زندگی کے رومانوی تعلقات کو گہرائی سے متاثر کرتے ہیں[38]۔ اس کے مطابق، ایک محفوظ وابستگی کا تعلق اعتماد، حمایت اور صحت مندی کی بنیاد بنتا ہے۔ سوشیالوجی میں، محبت کو ایک سماجی تعمیر کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو ثقافت، معاشرتی اقدار اور تاریخی سیاق وسباق سے تشکیل پاتی ہے۔ ایوینگ گوف مین نے اپنے ڈراماتی نقطہ نظر میں دلیل دی کہ محبت کا اظہار معاشرتی اسکرپٹس اور کردار ادا کرنے سے متاثر ہوتا ہے، جہاں افراد معاشرتی توقعات کے مطابق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں[39]۔ جدید دور میں، سوشیالوجسٹ محبت میں صنفی کردار، طاقت کے توازن، اور معاشرتی تبدیلیوں کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محبت صرف ایک ذاتی جذبہ نہیں بلکہ ایک سماجی رجحان ہے جو معاشرتی ڈھانچے کو برقرار رکھنے یا تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان دونوں شعبوں کا مجموعی نقطہ نظریہ ہے کہ محبت ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی رجحان ہے جسے سمجھنے کے لیے انفرادی جذبات اور سماجی ڈھانچے دونوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

8۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے محبت

فرائیڈ کا نظریہ محبت

سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ محبت کی بنیاد ان کے اس عمومی نفسیاتی نظریے پر ہے جس کے مطابق انسانی شخصیت اور اس کے تمام اعمال کے پیچھے بنیادی محرک "جبلتِ جنس" ہے۔ فرائیڈ کے ہاں جنس کا مفہوم نہایت وسیع ہے جس میں ہر قسم کی محبت شامل ہے، چاہے وہ والدین کی اولاد سے ہو، انسانوں کی اشیاء یا مجرد تصورات سے ہو، یا پھر رومانوی ہو[40]۔ فرائیڈ کے نزدیک محبت دراصل جنسی تسکین کی ایک معطل شدہ شکل (Inhibited Aim) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی جنسی جبلت جب اپنے بنیادی مقصد یعنی جنسی تسکین سے ہٹ کر کسی اور مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہے تو وہ محبت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنی کتاب "تہذیب اور اس کے عوارض (Civilization and Its Discontents)" میں واضح کیا ہے کہ "ہم نے کہا تھا کہ انسان نے تجربے سے یہ پایا ہے کہ جنسی (جنٹل) محبت اسے سب سے بڑی تسکین فراہم کرتی ہے، چنانچہ یہ عملاً اس کے لیے تمام خوشی کی ایک نمونہ (Prototype) بن گئی[41]"۔ تاہم، فرائیڈ یہ بھی مانتے ہیں کہ یہی جنسی محبت انسان کو اس کے محبوب کے سامنے انتہائی غیر محفوظ اور Dependent بنا دیتی ہے، جس کے رد ہو جانے یا محبوب کی موت واقع ہو جانے کی صورت میں انسان کو انتہائی تکلیف دہ صدمے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر انسان اپنی محبت کو "معطل" کر دیتا ہے، یعنی اس کا مقصد صرف جنسی تسکین نہیں رہتا بلکہ وہ دوسروں سے محبت کرنے کے عمل کو ہی اپنی تسکین بنا لیتا ہے۔ اس طرح وہ محبت کے جذبے کو صرف ایک شخص تک محدود رکھنے کے بجائے تمام انسانوں تک پھیلا دیتا ہے، جس سے اسے مستقل بنیادوں پر ایک قسم کی تسکین حاصل ہوتی رہتی ہے اور محبوب کے چلے جانے کے شدید صدمے سے بھی بچا رہتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک محبت کے تعلق میں ایک اہم بات جذبات کی "مخالفت (Ambivalence)" بھی ہے۔ یعنی ہر قریبی اور گہرے رشتے میں محبت اور نفرت دونوں جذبات یکجا موجود رہتے ہیں۔ چاہے شوہر اور بیوی کا رشتہ ہو، والدین اور اولاد کا تعلق ہو، ہم consciously تو محبت محسوس کرتے ہیں لیکن لاشعوری طور پر انہی کے خلاف منفی، حاسدانہ اور تخریبی جذبات و خیالات بھی موجود رہتے ہیں، جو کہ انسانی فطرت کا حصہ ہیں۔ نیز، فرائیڈ کا "ٹرانسفرنس (Transference)" کا نظریہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے موجودہ محبوبوں کے انتخاب پر اپنے بچپن کے والدین یا سرپرستوں کے ساتھ تعلقات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ یعنی ہم درحقیقت اپنے محبوب کو "دوبارہ تلاش" کر رہے ہوتے ہیں، اور اکثر ایسے ساتھی منتخب کرتے ہیں جو ہمیں ہمارے والدین کی خصوصیات کی یاد دلاتے ہوں۔

---

[38] جان بولبی، اٹیچمنٹ اینڈ لاس، جلد 1، (نیویارک: بیسیک بکس، 1969)، 145

[39] ایرونگ گوف مین، پریزنٹیشن آف سیلف ان ایوری ڈے لائف، (نیویارک: اینکر بکس، 1959)، 67

[40] سعید احمد رفیق، فرائڈ کا نظریۂ ادب، (لاہور: ریختہ، 2023)، 45

[41] Sigmund Freud, Civilization and Its Discontents, (London: Hogarth Press, 1930), 82

کارل یونگ کا تصورِ انا اور محبت

کارل گستاف یونگ، جو ابتدا میں فرائیڈ کے قریبی ساتھی تھے، نے محبت کے بارے میں ایک زیادہ وسیع اور روحانی نقطہ نظر پیش کیا۔ یونگ فرائیڈ کی طرح محبت کو محض جنسی جبلت کی معطل شدہ شکل نہیں مانتے تھے۔ ان کے نزدیک محبت ایک ایسی قوت ہے جو انسان کے "نفسیاتی وجود (Psyche) " کے مختلف حصوں، خاص طور پر "انا(Ego) "، "Persona"(سامنے والا روپ)، اور "سایہ (Shadow) " کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یونگ کے مطابق، "انا" ہماری شعوری شخصیت کا مرکز ہے، جو ہمارے خود آگاہی اور فیصلہ سازی کا ذمہ دار ہے۔ محبت کا سفر درحقیقت انا کی تکمیل کا سفر ہے، جس میں انسان اپنے ظاہری "Persona" (وہ ماسک جو ہم دنیا کے سامنے پہنتے ہیں) اور چھپے ہوئے "سایہ" (وہ تاریک پہلو جو ہم خود سے چھپاتے ہیں) کے درمیان توازن قائم کرتا ہے[42]۔ یونگ کی مشہور کتاب "میموریز، ڈریمز، ریفلکشنز" میں ان کی اہلیہ ایما یونگ کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے جو محبت کے انا سے بالاتر ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ یونگ لکھتے ہیں، "ایما نے مجھ سے کہا، 'تم مجھ سے محبت کرتے ہو، لیکن تم مجھے نہیں جانتے۔' یہ جملہ میرے لیے بہت گہرا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ محبت کا تعلق صرف انا کی خواہشات سے نہیں، بلکہ دوسرے شخص کی مکمل حقیقت کو تسلیم کرنے سے ہے[43]"۔ یونگ کے نزدیک حقیقی محبت کا مطلب ہے دوسرے فرد کے "خود (Self) " کو اس کی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ قبول کرنا، نہ کہ صرف اس کے وہ پہلو دیکھنا جو ہمارے اپنے انا کو بھاتے ہوں۔ اس سفر کا حتمی مقصد "Individualion" ہے، یعنی ایک ایسی مکمل شخصیت کی تشکیل جس میں شعور و لاشعور، مردانہ و زنانہ صفات(Anima/Animus) ، اور ہر قسم کے تضادات باہم مل کر ہم آہنگ ہو جائیں۔ یونگ کے نظریے کے مطابق، محبت ہمیں اپنے اندر کے ان خفیہ پہلوؤں سے روشناس کرواتی ہے جنہیں ہم عام طور پر دیکھنے سے گریز کرتے ہیں، اور یوں ہمیں وجود کو مکمل کرنے میں مدد دیتی ہے۔

جدید نفسیات میں محبت بطور انسانی ضرورت

جدید نفسیات میں فرائیڈ اور یونگ کے بعد محبت کو ایک بنیادی انسانی ضرورت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ جدید ماہرین نفسیات نے محبت کو محض ایک جذبہ یا معطل شدہ جنسی جبلت نہ سمجھتے ہوئے اسے انسانی نفسیاتی صحت، نشوونما اور سالمیت کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ جان بالبی کا "وابستگی کا نظریہ (Attachment Theory) " اس سلسلے میں سب سے اہم ہے۔ بالبی کے مطابق، بچپن میں والدین یا بنیادی دیکھ بھال کرنے والوں کے ساتھ محبت اور اعتماد پر مبنی تعلق، بچے میں محفوظ وابستگی (Secure Attachment) پیدا کرتی ہے، جو اس کی آئندہ زندگی کے تمام تعلقات کی بنیاد بنتی ہے[44]۔ اگر بچہ محبت اور شفقت کے تحفظ کا احساس نہیں کر پاتا، تو اس میں وابستگی کے مسائل (Attachment Disorders) پیدا ہو سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ جوانی میں تعلقات قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے ۔ جدید نفسیاتی تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ محبت اور مثبت تعلقات نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی صحت پر بھی گہرے مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ محبت کا تجربہ دماغ میں آکسیٹوسن (Oxytocin) نامی ہارمون کی شرح بڑھاتا ہے، جسے "محبت کا ہارمون" یا "bonding hormone" کہا جاتا ہے۔ یہ ہارمون تناؤ کو کم کرتا ہے، اعتماد بڑھاتا ہے اور دوسروں کے ساتھ جذباتی تعلق کو مضبوط بناتا ہے۔ جدید نقطہ نظر کے مطابق محبت کی مختلف شکلیں ہیں۔ رومانوی محبت، پلاٹونیک محبت، کنبہ کی محبت، اور خود سے محبت اور یہ سب انسان کی نفسیاتی بہبود کے لیے یکساں اہم ہیں۔ ایرک فروم جیسے ماہرین نے زور دیا ہے کہ محبت صرف ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک فعال عمل ہے، جس میں دیکھ بھال، ذمہ داری، احترام اور علم شامل ہیں[45]۔ اس طرح، جدید نفسیات محبت کو انسانی وجود کی ایک ایسی اساس کے طور پر دیکھتی ہے جس کے بغیر فرد کی نفسیاتی صحت اور شخصیتی تکمیل کا تصور بھی ممکن نہیں۔

9۔ سماجی و معاشرتی پہلو

محبت بطور خاندان کی بنیاد

خاندان انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور محبت اس اکائی کو مضبوطی سے جوڑنے والا سب سے اہم عنصر ہے۔ محبت ہی وہ جذبہ ہے جو شادی کے بندھن کو مضبوط کرتی ہے، والدین اور اولاد کے درمیان گہرا رشتہ قائم کرتی ہے، اور خاندان کے تمام افراد کو ایک دوسرے سے جڑے رکھتی ہے۔ جدید سماجیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے

---

[42] کارل یونگ، Psychology and Religion, (New Haven: Yale University Press, 1938), 76

[43] کارل یونگ، Memories, Dreams, Reflections, (New York: Pantheon Books, 1963), 155

[44] جان بالبی، اٹیچمنٹ اینڈ لاس، جلد 1، (نیویارک: بیسیک بکس، 1969)، 145

[45] ایرک فروم، دی آرٹ آف لوونگ، (نیویارک: ہارپر اینڈ رو، 1956)، 78

کہ جن خاندانوں میں محبت، اعتماد اور باہمی تعاون کا ماحول ہوتا ہے، وہاں کے افراد ذہنی اور جذباتی طور پر زیادہ صحت مند ہوتے ہیں[46]۔ محبت خاندان کو صرف جذباتی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی مضبوط بناتی ہے، جہاں افراد مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اور مشترکہ مسائل کا مقابلہ مل کر کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں بھی خاندان کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور باہمی محبت و رحم کو خاندانی تعلقات کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں"[47]۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ محبت اور رحمت خاندانی رشتوں کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ خاندان کی محبت انسان کی پہلی سماجی درسگاہ ہوتی ہے، جہاں وہ دینا کے بارے میں بنیادی باتیں سیکھتا ہے۔ یہیں سے وہ ہمدردی، تعاون، صبر اور قربانی جیسی اہم سماجی اقدار سیکھتا ہے۔ ماہرین سماجیات کا کہنا ہے کہ خاندان کی محبت انسان کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس کے future سماجی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتی ہے[48]۔ اس طرح محبت نہ صرف خاندان کی بنیاد ہے بلکہ پورے معاشرے کی صحت اور استحکام کی ضامن بھی ہے۔

سماجی رشتوں میں محبت کا کردار

سماجی رشتے انسانی معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں اور محبت ان رشتوں کو مضبوط بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ دوستی، ہمسائیگی، اور دیگر سماجی تعلقات میں محبت اعتماد، وفاداری اور باہمی تعاون کی بنیاد ہوتی ہے۔ سماجی رشتوں میں محبت کا مطلب صرف جذباتی وابستگی ہی نہیں، بلکہ عملی طور پر دوسروں کی مدد کرنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا، اور ان کی خوشیوں میں شامل ہونا بھی ہے[49]۔ جدید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ مضبوط سماجی رشتے نہ صرف ذہنی صحت کے لیے فائدہ مند ہیں بلکہ جسمانی صحت پر بھی مثبت اثرات ڈالتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس مضبوط سماجی نیٹ ورک ہوتا ہے، وہ تناؤ اور بیماریوں کا زیادہ بہتر مقابلہ کر پاتے ہیں[50]۔ محبت سماجی رشتوں میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور تنازعات کو حل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ جب سماجی رشتے محبت کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں تو معاشرے میں امن اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی سماجی رشتوں کو مضبوط بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے"[51]۔ یہ حدیث سماجی رشتوں میں محبت اور ہمدردی کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ محبت ہی وہ قوت ہے جو مختلف الثقافتی معاشروں میں رواداری اور باہمی احترام کو فروغ دیتی ہے۔ جب مختلف مذاہب، ثقافتوں اور نسلوں کے لوگ محبت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جڑتے ہیں تو ایک پرامن اور ہم آہنگ معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس طرح محبت سماجی رشتوں کو نہ صرف مضبوط بناتی ہے بلکہ پورے معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کی راہ ہموار کرتی ہے۔

محبت اور جدید معاشرتی رویے

جدید معاشرے میں محبت کے تصور اور اظہار دونوں میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ جدیدیت، شہری کاری، اور ٹیکنالوجی کے اثرات نے محبت کے روایتی تصورات کو نئے شکلوں میں ڈھالا ہے۔ آج کے دور میں محبت کے اظہار کے طریقے بدل گئے ہیں، جہاں سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل مواصلات نے محبت کے نئے ذرائع پیدا کیے ہیں[52]۔ جدید معاشرتی رویوں میں محبت زیادہ انفرادی اور خود مختار ہوتی جا رہی ہے، جہاں افراد اپنی پسند کی بنیاد پر رشتے قائم کرتے ہیں۔ جدید معاشروں میں محبت کا تعلق اب صرف روایتی خاندانی ڈھانچے تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس نے مختلف شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ جدید تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ جدید معاشرے میں محبت کے مسائل بھی بدل گئے ہیں۔ تنہائی، ذہنی تناؤ، اور تعلقات کی عدم استحکام جیسے مسائل آج کے دور میں عام ہیں[53]۔ جدید معاشرتی رویوں میں محبت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس کے

---

[46] عائشہ ملک، خاندانی نظام اور جدید سماجی تبدیلیاں، (لاہور: پاکستان سوشیالوجیکل ریویو، 2021)، 78

[47] سورہ الروم، آیت 21

[48] ڈاکٹر عبداللہ چودھری، سماجیات پاکستان، (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2019)، 112

[49] پروفیسر محمد اسلم، سماجی رشتے اور انسانی رویے، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2020)، 145

[50] این میری، سوشل نیٹ ورکس اینڈ ہیلتھ، (نیویارک: سوشل سائنس ریسرچ، 2018)، 89

[51] صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر 13

[52] ڈاکٹر نادیہ شہزادی، ڈیجیٹل دور میں محبت، (لاہور: معاصر پبلیکیشنز، 2023)، 156

[53] جان ڈیو، ماڈرن لوئ اینڈ سوسائٹی، (لندن: سوشل سائنس پبلیشر، 2022)، 134

اظہار اور تجربے کے طریقوں میں واضح تبدیلیاں آئی ہیں۔ جدید دور میں محبت کا تصور زیادہ مساوات پر مبنی ہے، جہاں مرد و عورت دونوں کے جذبات اور خواہشات کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے۔ جدید معاشرے میں محبت کے بارے میں آگہی بھی بڑھی ہے، جہاں لوگ محبت کی نفسیاتی اور سماجی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ جدید تعلیم اور میڈیا نے محبت کے بارے میں بحث و تمحیص کو فروغ دیا ہے، جس سے معاشرے میں محبت کے تصورات میں تنوع آیا ہے۔ اگرچہ جدید معاشرتی رویوں نے محبت کے کچھ پہلوؤں کو تبدیل کیا ہے، لیکن محبت کی بنیادی اہمیت اور انسانی تعلقات میں اس کی مرکزی حیثیت برقرار ہے۔ محبت آج بھی انسانی زندگی کی سب سے بنیادی اور اہم ضرورت ہے، چاہے اس کے اظہار کے طریقے زمانے کے ساتھ بدل جائیں۔

10۔وجودیت (Existentialism) اور محبت

کیر کیگارڈ کا تصورِ محبت

سورن کیر کیگارڈ، جنہیں وجودیت کا بانی مانا جاتا ہے، نے محبت کو ایک گہرے مذہبی اور وجودی تناظر میں پیش کیا۔ ان کے نزدیک محبت کوئی جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک اخلاقی فرض اور مذہبی تقاضا ہے۔ کیر کیگارڈ اپنی کتاب "Works of Love" میں محبت کی دو اقسام بیان کرتے ہیں: محبتِ جذباتی (Erotic Love) اور محبتِ فرضی (Ethical Love)۔ محبتِ جذباتی وہ ہے جو خوبصورتی، کشش یا مفاد پر مبنی ہو، جبکہ محبتِ فرضی وہ ہے جو خدا کے حکم پر مبنی ہو اور جس میں ہر انسان سے یکساں محبت کی جائے[54]۔ کیر کیگارڈ کے نزدیک حقیقی محبت وہ ہے جو خدا کی طرف سے عطا کردہ فرض کے طور پر کی جائے، نہ کہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنیاد پر۔ وہ لکھتے ہیں: "عیسائی محبت کا حکم ہے: تمہیں اپنے پڑوسی سے محبت کرنی چاہیے۔ یہ ایک حکم ہے، ایک انتخاب نہیں۔ تم اسے پسند کرو یا نہ کرو، تمہیں محبت کرنی ہے[55]"۔ کیر کیگارڈ کے ہاں محبت کا یہ تصور ان کے وجودی فلسفے کے مرکزی خیال "انتخاب" اور "ذمہ داری" سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان اپنے وجود کو محبت کے ذریعے ہی حقیقی معنوں میں پا سکتا ہے، لیکن یہ محبت ذاتی خواہشات سے بالاتر ہو کر خدا کے حکم کی پیروی کرتی ہو۔ کیر کیگارڈ کے نزدیک محبت درحقیقت ایک طرح کی عبادت ہے، جس میں انسان اپنے انا کو قربان کر کے دوسرے کی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو انسان کو اس کے وجود کے حقیقی مقصد سے روشناس کرواتی ہے۔

سارتر کے ہاں محبت اور آزادی

ژاں پال سارتر کے وجودی فلسفے میں محبت اور آزادی کے درمیان ایک پیچیدہ تعلق پایا جاتا ہے۔ سارتر کے نزدیک انسان بنیادی طور پر آزاد ہے، اور یہ آزادی اس کے وجود کا مرکز ہے۔ محبت کے معاملے میں سارتر کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ محبت درحقیقت اپنی آزادی کو محفوظ کرتے ہوئے دوسرے کی آزادی پر قبضہ کرنے کی کوشش ہے۔ سارتر اپنی مشہور کتاب "Being and Nothingness" میں لکھتے ہیں: "عاشق ہمیشہ چاہتا ہے کہ محبوب اسے دنیا کا مرکز سمجھے، اور اس کی آزادی اس کے سامنے جھک جائے[56]"۔ سارتر کے نزدیک محبت کا رشتہ درحقیقت دو آزادوں کے درمیان ایک کشمکش ہے، جہاں ہر فرد چاہتا ہے کہ دوسرا اس کی ملکیت بن جائے، لیکن ساتھ ہی وہ خود آزاد رہے۔ سارتر محبت میں "بد نظری (Bad Faith) " کے تصور پر بھی زور دیتے ہیں، جہاں انسان اپنی آزادی سے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت میں فرد اکثر اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے دوسرے پر انحصار کرتا ہے، جو درحقیقت اس کی اپنی آزادی کے انکار کے برابر ہے[57]۔ سارتر کے فلسفے میں محبت کا یہ تناقض پایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو انسان دوسرے سے محبت کر کے اسے اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے، اور دوسری طرف وہ خود کسی کی ملکیت بننا نہیں چاہتا۔ اس کشمکش کے باعث سارتر محبت کو ایک ناممکن آرزو قرار دیتے ہیں، جس میں ہمیشہ تناؤ اور Conflict پایا جاتا ہے۔

وجودی فکر میں محبت کی محدودیت

وجودی فلسفے میں محبت کے تصور کی کئی بنیادی محدودیتیں پائی جاتی ہیں۔ اولاً، وجودیت کا مرکزی خیال فرد کی تنہائی اور اس کی ذاتی ذمہ داری ہے، جس کے باعث محبت کے باہمی تعلق کو صحیح معنوں میں سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البیر کامیو اپنی کتاب "The Myth of Sisyphus" میں لکھتے ہیں: "ایک غیر معقول دنیا میں محبت بھی ایک غیر معقول عمل ہے۔ یہ ہمیں عارضی تسلی تو دے سکتی ہے، لیکن حتمی معنی عطا نہیں کر سکتی[58]"۔ دوماً، وجودیت میں آزادی کے تصور نے محبت کے رشتے کو ایک Conflict

---

Søren Kierkegaard, Works of Love, (New York: Harper Perennial, 2009), 58 [54]

Søren Kierkegaard, Works of Love, (New York: Harper Perennial, 2009), 67 [55]

Jean-Paul Sartre, Being and Nothingness, (New York: Washington Square Press, 1993), 478 [56]

Jean-Paul Sartre, Existentialism is a Humanism, (New Haven: Yale University Press, 2007), 45 [57]

Albert Camus, The Myth of Sisyphus, (London: Penguin Books, 2005), 78 [58]

کی شکل دے دی ہے۔ سارتر کے مطابق، "جہنم دوسرے لوگ ہیں[59]"، اور یہ خیال محبت کے مثبت پہلوؤں کو سمجھنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ سوماً، وجودی فلسفہ اکثر محبت کے جذباتی اور روحانی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے، جس کے باعث محبت کا تصور خشک اور مکانیکی ہو جاتا ہے۔ مارٹن بوبر نے وجودیت کی اس محدودیت پر تنقید کرتے ہوئے کہا: "وجودیت نے 'میں' کو تو دریافت کیا، لیکن 'تو' کو بھلا دیا[60]"۔ وجودی فکر کی یہ محدودیتیں اسے محبت کے مکمل تصور کو سمجھنے میں ناکام بنا دیتی ہیں، کیونکہ محبت کا تعلق صرف فرد کی ذاتی ذمہ داری یا آزادی سے نہیں، بلکہ باہمی تعلق، اعتماد، اور روحانی یکجہتی سے ہے۔

11۔ تقابلی مطالعہ: تصوف اور جدید فلسفہ

مقصد کا فرق: الٰہی قرب بمقابلہ دنیوی خواہش

تصوف اور جدید فلسفہ محبت کے درمیان بنیادی فرق ان کے مقاصد میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ تصوف کا مقصد محبت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے قرب حاصل کرنا ہے، جبکہ جدید فلسفہ عام طور پر محبت کو دنیوی تعلقات اور نفسیاتی تسکین تک محدود سمجھتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک محبت ایک روحانی سفر ہے جس کا ہدف ذات باری تعالیٰ سے وصال ہے۔ امام غزالی اپنی شہرہ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" میں واضح کرتے ہیں کہ "محبت کی انتہا یہ ہے کہ بندہ اپنی ہر چیز کو محبوب حقیقی کے لیے قربان کر دے اور اس کی رضا کو اپنی رضا بنالے"[61]۔ اس کے برعکس، جدید فلسفہ محبت کو زیادہ تر انسانی تعلقات اور ذاتی تسکین کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ مثال کے طور پر، سگمنڈ فرائیڈ محبت کو بنیادی طور پر جنسی جبلت کی معطل شدہ شکل قرار دیتے ہیں[62]۔ تصوف میں محبت کا مقصد "فنا فی اللہ" اور "بقاباللہ" کے اعلیٰ مراتب تک پہنچنا ہے، جبکہ جدید فلسفہ میں محبت کا تعلق زیادہ تر انسانی نفسیات، سماجی تعلقات اور ذاتی خوشی سے ہے۔ یہ بنیادی فرق دونوں نقطہ ہائے نظر کے درمیان ایک واضح dividing line کھینچ دیتا ہے۔

سمت کا فرق: روحانی کمال بمقابلہ نفسیاتی تسکین

تصوف اور جدید فلسفہ محبت کی سمت میں بھی واضح فرق پایا جاتا ہے۔ تصوف میں محبت کی سفت اوپر کی طرف ہے، یعنی مخلوق سے ہوتی ہوئی خالق تک پہنچنا، جبکہ جدید فلسفہ میں محبت کی حرکت عموماً افقی ہوتی ہے، یعنی انسان سے انسان کے تعلقات تک محدود رہتی ہے۔ صوفیاء کرام کے نزدیک محبت کی سمت درجہ بدرجہ ارتقا پذیر ہوتی ہے، جیسا کہ مولانا رومی فرماتے ہیں: یعنی "عشق وہ ہے جو ہر چیز کو جلا دے"[63]۔ اس کے برعکس، جدید فلسفی ایرک فروم محبت کو ایک skill کے طور پر دیکھتے ہیں جسے انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات میں استعمال کرتا ہے[64]۔ تصوف میں محبت کی سفت بیرون سے باطن کی طرف ہوتی ہے، جہاں انسان اپنے اندر کی دنیا کو پاک کر کے اللہ کی محبت حاصل کرتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ میں محبت کی سفت عام طور پر خارجی تعلقات کی طرف ہوتی ہے۔ اس فرق کے باعث تصوف میں محبت کا نتیجہ روحانی کمال کی صورت میں نکلتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ میں اس کا نتیجہ نفسیاتی تسکین اور سماجی ہم آہنگی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

نتائج کا فرق: اخلاقی و روحانی ارتقا بمقابلہ مادی تعلقات

تصوف اور جدید فلسفہ محبت کے نتائج میں بھی واضح فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ تصوف میں محبت کا نتیجہ فرد کے اخلاقی اور روحانی ارتقا کی صورت میں نکلتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ میں محبت کے نتائج زیادہ تر مادی تعلقات اور سماجی فوائد تک محدود رہتے ہیں۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں: "محبت کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ بندہ اپنی انا کو فنا کر دے اور اللہ کی صفات سے متصف ہو جائے"[65]۔ اس کے برعکس، جدید ماہر نفسیات جان بولبی محبت کے نتائج کو محفوظ وابستگی (secure attachment) اور ذہنی صحت کے تناظر میں دیکھتے ہیں[66]۔ تصوف میں محبت کا نتیجہ "انسان کامل" کی صورت میں نکلتا ہے، جو اپنے ظاہر و باطن میں اللہ کے اسوہ حسنہ کی نمائندگی کرتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ

---

[59] Jean-Paul Sartre, No Exit, (New York: Vintage Books, 1989), 45

[60] Martin Buber, I and Thou, (New York: Charles Scribner's Sons, 2000), 89

[61] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 312

[62] Sigmund Freud, Civilization and Its Discontents, (London: Hogarth Press, 1930), 82

[63] مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر اول (استنبول: نشر فرھنگ، 2010)، 24

[64] Erich Fromm, The Art of Loving, (New York: Harper & Row, 1956), 78

[65] امام ربانی، مکتوبات امام ربانی، جلد 1 (کراچی: مکتبہ مدینہ، 2007)، 88

[66] John Bowlby, Attachment and Loss, Vol. 1, (New York: Basic Books, 1969), 145

میں محبت کا نتیجہ ایک "صحت مند شخصیت" کی صورت میں سامنے آتا ہے، جو سماجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ یہ فرق درحقیقت دونوں نقطہ ہائے نظر کے بنیادی مفروضوں میں فرق کی عکاسی کرتا ہے۔

12۔ مشترکہ پہلو

محبت بطور انسانی زندگی کی بنیادی قوت

تصوف اور جدید فلسفہ دونوں محبت کو انسانی زندگی کی بنیادی اور مرکزی قوت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں، اگرچہ وہ اس کے ماخذ اور مقاصد کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک محبت کائنات کی تخلیق کا محرک ہے، جیسا کہ مشہور صوفی بزرگ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں" :کان اللہ ولم یکن معہ شئ، فاحب ان یعرف فخلق الخلق "یعنی "اللہ تھا اور اس کے ساتھ کچھ نہیں تھا، پس اس نے چاہا کہ پہچانا جائے تو اس نے مخلوق کو پیدا کیا"[67]۔ اس طرح صوفیاء محبت کو وجود کی بنیادی قوت مانتے ہیں۔ اسی طرح جدید فلسفہ میں بھی محبت کو انسانی وجود کی مرکزی قوت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ فلسفی ایرک فروم اپنی کتاب "دی آرٹ آف لوینگ" میں لکھتے ہیں" :محبت وہ واحد تسلی بخش اور معقول ترین جواب ہے جو انسان کے وجود کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے[68]"۔ دونوں مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ محبت کے بغیر انسانی زندگی بے معنی اور ادھوری ہے۔ صوفیاء کے نزدیک محبت الٰہی ہی وہ قوت ہے جو انسان کو اس کے حقیقی مقصد تک پہنچاتی ہے، جبکہ جدید فلسفی محبت کو انسانی تعلقات کی بنیادی ضرورت سمجھتے ہیں۔ دونوں ہی نقطہ نظر محبت کو زندگی کی تشکیل اور ارتقا میں کلیدی کردار ادا کرنے والی قوت مانتے ہیں۔

محبت سے شخصیت کی تکمیل

تصوف اور جدید فلسفہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ محبت انسان کی شخصیت کی تکمیل اور ارتقا کا ذریعہ ہے۔ صوفیاء کے نزدیک حقیقی محبت انسان کو "انسان کامل" بناتی ہے، جیسا کہ امام غزالی فرماتے ہیں" :محبت کی انتہا یہ ہے کہ بندہ اپنی ہر چیز کو محبوب حقیقی کے لیے قربان کر دے اور اس کی رضا کو اپنی رضا بنا لے[69]"۔ اس طرح محبت انسان کو اپنی انا سے بالاتر ہو کر ایک اعلیٰ روحانی وجود بناتی ہے۔ جدید نفسیات میں بھی محبت کو شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ مانا جاتا ہے۔ کارل یونگ کے مطابق محبت انسان کے "انا" اور "سایہ" کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتی ہے، جس سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے[70]۔ دونوں نقطہ نظر اس بات پر متفق ہیں کہ محبت انسان کو خود شناسی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک یہ خود شناسی درحقیقت خدا شناسی کی طرف لے جاتی ہے، جبکہ جدید نفسیات میں یہ فرد کی اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں محبت انسان کو ایک مکمل اور balanced personality عطا کرتی ہے۔

محبت کو انسان کی فطری ضرورت ماننا

تصوف اور جدید فلسفہ دونوں محبت کو انسان کی فطری ضرورت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک محبت انسان کی فطرت میں ودیعت کردہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے" :وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ[71]"۔ صوفیاء سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں محبت الٰہی کی فطری چنگاری موجود ہے، جسے صرف راہنمائی اور مجاہدے سے شعلہ بنانا ہوتا ہے۔ اسی طرح جدید نفسیات میں بھی محبت کو انسان کی بنیادی فطری ضرورت مانا جاتا ہے۔ جان بولبی کا "وابستگی کا نظریہ Attachment) " (Theory اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ محبت اور attachment انسان کی بقا اور نشوونما کے لیے ضروری ہیں[72]۔ دونوں مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ محبت کے بغیر انسان کی نفسیاتی اور روحانی نشوونما ناممکن ہے۔ صوفیاء کے نزدیک یہ ضرورت انسان کو خدا کی طرف کھینچتی ہے، جبکہ جدید نفسیات میں یہ ضرورت انسان کو دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں محبت انسان کی فطرت کا اٹوٹ حصہ ہے جس کے بغیر اس کا وجود ادھورا رہتا ہے۔

---

[67] ابن عربی، فصوص الحکم، (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 56

[68] Erich Fromm, The Art of Loving, (New York: Harper & Row, 1956), 78

[69] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4(بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 312

[70] Carl Jung, Psychology and Religion, (New Haven: Yale University Press, 1938), 76

[71] سورہ البقرہ، آیت: 165

[72] John Bowlby, Attachment and Loss, Vol. 1, (New York: Basic Books, 1969), 145

13۔اختلافی پہلو

تصوف میں محبت کا ماورائی اور الٰہی رخ

تصوف میں محبت کا تصور بنیادی طور پر ماورائی اور الٰہی ہے، جہاں محبت کا حتمی ہدف ذات باری تعالیٰ کا قرب و وصال ہے۔ صوفیاء کے نزدیک محبت کی تمام شکلیں در حقیقت محبت الٰہی ہی کی مختلف جہتیں ہیں۔ امام غزالی اپنی شہرہ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" میں محبت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "محبت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے محبوب کی طرف اس طرح مائل ہو کہ اس کے سوا کسی اور کی طرف التفات نہ کرے"[73]۔ صوفیاء کا ماننا ہے کہ محبت کی ابتدا مخلوق سے ہوتی ہے لیکن انتہا خالق پر ہوتی ہے۔ مولانا رومی اپنی مثنوی میں اس نقطہ کو یوں بیان کرتے ہیں: "ہر کہ او محبوب شد در کون و مکان / آخرش محبوب باشد لا مکان" یعنی "جو شخص بھی زمان و مکان میں کسی کا محبوب بنا، اس کا انجام لا مکان (خدا) کے ساتھ محبوبیت ہے"[74]۔ تصوف میں محبت کا یہ رخ مکمل طور پر روحانی اور ماورائی ہے، جہاں مادی دنیا اور اس کی محبتیں محض راستے کے پتھر ہیں۔ محبت الٰہی کی اس راہ میں صوفی اپنی انا، اپنی خواہشات، بلکہ اپنی پوری ذات کو محبوب حقیقی کی ذات میں فنا کر دیتا ہے۔ یہ فنا در حقیقت بقا کا باعث بنتی ہے، جہاں صوفی کی ذات اللہ کی صفات سے متصف ہو جاتی ہے۔

جدید فلسفے میں محبت کا دنیاوی اور نفسیاتی رخ

جدید فلسفہ محبت کو بنیادی طور پر ایک دنیاوی اور نفسیاتی مظہر کے طور پر دیکھتا ہے، جس کا تعلق انسانی جذبات، خواہشات اور سماجی تعلقات سے ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ، جو جدید نفسیات کے بانیوں میں سے ہیں، محبت کو جنسی جبلت کی معطل شدہ شکل قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "Civilization and Its Discontents" میں لکھتے ہیں: "جنسی محبت انسان کو سب سے بڑی تسکین فراہم کرتی ہے، چنانچہ یہ عملاً اس کے لیے تمام خوشی کی ایک نمونہ بن گئی"[75]۔ جدید فلسفہ میں محبت کا تعلق زیادہ تر انسانی نفسیات اور سماجی dynamics سے ہے۔ ایرک فروم جیسے فلسفی محبت کو ایک ہنر کے طور پر دیکھتے ہیں جسے سیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "دی آرٹ آف لوینگ" میں لکھتے ہیں: "محبت صرف ایک جذبہ نہیں ہے، بلکہ ایک فیصلہ ہے، ایک حکم ہے، ایک وعدہ ہے"[76]۔ جدید فلسفے میں محبت کا تصور عملی، مادی اور انسانی تعلقات تک محدود ہے۔ یہاں محبت کا مقصد روحانی تکمیل نہیں بلکہ ذاتی تسکین، سماجی ہم آہنگی اور نفسیاتی صحت ہے۔ جدید نقطہ نظر محبت کے ماورائی پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہے اور اسے محض انسانی تجربے کی ایک شکل کے طور پر دیکھتا ہے۔

نتائج میں روحانی واخلاقی فرق

تصوف اور جدید فلسفہ محبت کے نتائج میں بھی بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ تصوف میں محبت کا نتیجہ انسان کی روحانی اور اخلاقی تکمیل کی صورت میں نکلتا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں: "محبت کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ بندہ اپنی انا کو فنا کر دے اور اللہ کی صفات سے متصف ہو جائے"[77]۔ اس کے برعکس، جدید فلسفہ میں محبت کے نتائج زیادہ تر مادی اور نفسیاتی ہوتے ہیں۔ جان بولبی کے "وابستگی کے نظریے" کے مطابق محبت کا نتیجہ محفوظ attachment اور ذہنی صحت کی صورت میں نکلتا ہے[78]۔ تصوف میں محبت انسان کو "انسان کامل" بناتی ہے جو اپنے اخلاق اور روحانی qualities میں ممتاز ہوتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ میں محبت انسان کو ایک "صحت مند شخصیت" عطا کرتی ہے جو سماجی تعلقات میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہ فرق در حقیقت دونوں مکاتب فکر کے بنیادی مفروضوں میں فرق کی عکاسی کرتا ہے۔

14۔تنقیدی جائزہ

اسلامی تصوف کے تصورِ عشق کی جامعیت

اسلامی تصوف کا تصورِ عشق ایک ایسی جامع اور ہمہ گیر حقیقت ہے جو وجود انسانی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ یہ تصور نہ صرف جذبات و احساسات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ عقل و روح کو بھی یکجا کرتا ہے۔ تصوف کے نزدیک عشق محض ایک انسانی جذبہ نہیں بلکہ کائناتی قوت ہے جو تخلیق کا محرک اور تمام موجودات کی حرکت کا باعث ہے۔

---

[73] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 305

[74] مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر اول (استنبول: نشر فرہنگ، 2010)، 156

[75] Sigmund Freud, Civilization and Its Discontents, (London: Hogarth Press, 1930), 82

[76] Erich Fromm, The Art of Loving, (New York: Harper & Row, 1956), 78

[77] امام ربانی، مکتوبات امام ربانی، جلد 1 (کراچی: مکتبہ مدینہ، 2007)، 88

[78] John Bowlby, Attachment and Loss, Vol. 1, (New York: Basic Books, 1969), 145

ابن عربی اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں تخلیق کائنات کی علت کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں "اللہ تھا اور اس کے ساتھ کچھ نہیں تھا، پس اس نے چاہا کہ پہچانا جائے تو اس نے مخلوق کو پیدا کیا"[79]۔ تصوف کا عشق انسان کو ذات باری تعالیٰ سے ملانے کا ذریعہ ہے، جہاں عاشق اپنی انا کو فنا کر کے محبوب حقیقی میں بقا پاتا ہے۔ مولانا رومی کے بقول عشق وہ قوت ہے جو انسان کو ظاہر سے باطن کی طرف، مخلوق سے خالق کی طرف سفر کرنے کی تحریک دیتی ہے" :عشق آن باشد کہ ہر چیز را سوزد "یعنی "عشق وہ ہے جو ہر چیز کو جلا دے"[80]۔ تصوف کا یہ تصورِ عشق انسان کی تمام تر نفسیاتی، روحانی اور اخلاقی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ یہ انسان کو صرف ذاتی تسکین ہی نہیں دیتا بلکہ اسے کائناتی حقیقتوں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ امام غزالی کے نزدیک عشق کی انتہا یہ ہے کہ بندہ اپنی ہر چیز کو محبوب حقیقی کے لیے قربان کر دے اور اس کی رضا کو اپنی رضا بنا لے[81]۔ اس طرح تصوف کا تصورِ عشق اپنی جامعیت میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔

جدید فلسفہ کی محدودیت اور مادیت پسندی

جدید فلسفہ، خاص طور پر مادیت پسندانہ مکاتب فکر، محبت کے تصور کو ایک محدود اور یک رخی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ یہ فلسفہ محبت کو محض مادی عوامل، نفسیاتی محرکات اور سماجی تعلقات تک محدود سمجھتا ہے۔ کارل مارکس کے جدلیاتی مادیت کے مطابق محبت جیسے تصورات در حقیقت معاشی اور سماجی ڈھانچے کی عکاسی کرتے ہیں[82]۔ جدید فلسفہ کا یہ نقطہ نظر محبت کی ماورائی اور روحانی جہت کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایرک فروم جیسے فلسفی اگرچہ محبت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ اسے بھی ایک مہارت کے طور پر پیش کرتے ہیں جسے سیکھا جا سکتا ہے[83]۔ جدید فلسفہ کی یہ محدودیت اسے محبت کی حقیقی ماہیت کو سمجھنے سے قاصر رکھتی ہے۔ جدلیاتی مادیت کے مطابق محبت جیسے تصورات مادی حالات کی پیداوار ہیں اور ان کا کوئی مستقل اور الہامی وجود نہیں ہے[84]۔ اس طرح جدید فلسفہ محبت کو اس کی روحانی بلندیوں سے گرا کر محض مادی اور نفسیاتی سطح تک محدود کر دیتا ہے۔ یہ نقطہ نظر انسان کی روحانی اور ماورائی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے، جس کے نتیجے میں جدید انسان روحانی خلا کا شکار ہو جاتا ہے۔

دونوں نظریات کے اثرات کا تقابلی تجزیہ

اسلامی تصوف اور جدید فلسفہ محبت کے اثرات کا تقابلی جائزہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی عملی افادیت کو واضح کرتا ہے۔ تصوف کا تصورِ عشق فرد اور معاشرے دونوں پر گہرے مثبت اثرات مرتسم کرتا ہے۔ فرد کے سطح پر یہ تصور انسان کو روحانی سکون، اخلاقی بلندی اور باطنی طاقت عطا کرتا ہے[85]۔ معاشرتی سطح پر تصوف کا عشق رواداری، اخوت اور خدمت خلق کے جذبات کو پروان چڑھاتا ہے۔ تاریخ میں صوفیاء کرام نے معاشروں میں امن و آشتی کا پرچار کیا اور مختلف ثقافتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ اس کے برعکس جدید فلسفہ محبت کے اثرات زیادہ تر فردانی اور مادی ہیں۔ جدید نفسیات کے مطابق محبت انسان کی نفسیاتی صحت کے لیے ضروری ہے[86]، لیکن یہ نقطہ نظر روحانی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتا ہے۔ جدید فلسفہ کا اثر معاشروں میں فردانیت اور مادیت پسندی کو فروغ دینا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی رشتے کمزور ہوتے ہیں۔ دونوں نظریات کے اثرات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تصوف کا عشق انسان کو خودی سے نجات دلا کر حقیقی آزادی کی طرف لے جاتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ کا تصور محبت انسان کو خودی کے دائرے میں ہی محدود رکھتا ہے۔

---

[79] ابن عربی، فصوص الحکم، (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 56

[80] مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر اول (استنبول: نشر فرهنگ، 2010)، 24

[81] امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد 4 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2001)، 305

[82] سگمنڈ فرائیڈ، Civilization and Its Discontents, (London: Hogarth Press, 1930), 82

[83] Erich Fromm, The Art of Loving, (New York: Harper & Row, 1956), 78

[84] کارل مارکس، Das Kapital, (Berlin: Verlag von Otto Meissner, 1867), 89

[85] امام ربانی، مکتوبات امام ربانی، جلد 1 (کراچی: مکتبہ مدینہ، 2007)، 88

[86] John Bowlby, Attachment and Loss, Vol. 1, (New York: Basic Books, 1969), 145

15۔ نتیجہ

تحقیق کا خلاصہ اور اہم نتائج

اس تحقیقی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تصوف اور جدید فلسفہ محبت کے تصورات میں بنیادی نوعیت کے فرق پائے جاتے ہیں۔ تصوف میں عشق ایک جامع اور ہمہ گیر حقیقت ہے جو انسان کو ذاتِ باری تعالیٰ سے وصل کا ذریعہ بناتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ محبت کو زیادہ تر مادی اور نفسیاتی سطح پر دیکھتا ہے۔ تصوف کا تصورِ عشق انسان کو روحانی ارتقا کی راہ پر گامزن کرتا ہے، جبکہ جدید فلسفہ میں محبت کے نتائج زیادہ تر دنیاوی اور عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے درمیان یہ فرق ان کے بنیادی مقاصد اور نظریاتی بنیادوں میں اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔

انسانِ جدید کے لیے اصل پیغام

اس تحقیق کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسانِ جدید محبت کے حقیقی تصور کو سمجھے اور اسے محض ایک نفسیاتی یا سماجی مظہر سمجھنے کے بجائے ایک روحانی قوت کے طور پر قبول کرے۔ حقیقی عشق وہ ہے جو انسان کے اندر کی ہر خودغرضی کو جلا دے اور اسے قربِ الٰہی کی طرف لے جائے۔ جدید انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ محبت کو صرف انسانی تعلقات تک محدود نہ رکھے بلکہ اسے کائناتی اور روحانی قوت کے طور پر پہچانے، جو تخلیقِ کائنات کا بنیادی محرک ہے۔ اس فہم کے ذریعے انسان اپنی زندگی میں سکون، مقصد اور معنویت پیدا کر سکتا ہے۔

عشقِ حقیقی کی عصری معنویت اور ضرورت

آج کے دور میں، جب انسان مادی ترقی کے باوجود روحانی طور پر خالی ہے، عشقِ حقیقی کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ جدید انسان کے اضطراب، بے چینی اور تنہائی کا علاج صرف عشقِ حقیقی میں پوشیدہ ہے۔ یہ عشق انسان کو خودی سے نکال کر صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہونے کی راہ دکھاتا ہے۔ عشقِ حقیقی انسان کو مادیت کے تنگ دائرے سے نکال کر روحانی وسعتوں سے روشناس کراتا ہے، اور یہی اس کی سب سے بڑی معنویت ہے۔ یہ نہ صرف فرد کو باطنی سکون عطا کرتا ہے بلکہ معاشرے میں محبت، امن اور ہم آہنگی کو فروغ دیتا ہے۔